مولانا محمد جعفر پھلواروی

ایک حدیث

غیر متقی امام کی اقتدا

سنن ابوداؤد میں کتاب الصلاۃ کا ۲۰۷ واں باب ہے ؛ امامۃ البرّ والفاجر۔ اس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک ارشادِ نبوی یوں مروی ہے :

الصلوٰۃ المکتوبۃ واجبۃ خلف کل مسلم برًّا کان او فاجراً وان عمل الکبائر۔

فرض نماز ہر مسلمان کے پیچھے واجب ہے خواہ متقی ہو یا فاجر۔ اگرچہ وہ کبائر کا مرتکب ہو چکا ہو۔

بیہقی نے جناب ابوہریرہؓ ہی سے یہ مضمون ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

صلّوا خلف کل برّ و فاجر، و صلّوا علیٰ کل بر و فاجر، و جاھدوا مع کل برّ و فاجر۔

سیوطی نے یہ حدیث الجامع الصغیر طبع قاہرہ ۱۳۷۳ھ کے حصہ دوم میں بیہقی کے حوالے سے نقل کی ہے اور اسے ضعیف بتایا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے :

ہر متقی و فاجر کے پیچھے نماز پڑھ لو اور ہر متقی و فاجر کی نماز جنازہ پڑھ لو اور ہر متقی و فاجر کے ساتھ مل کر جہاد کرو۔

جہاں تک ابوداؤد کی حدیث کا تعلق ہے اس میں متن یا سند کا کوئی سقم نہیں ظاہر کیا گیا ہے لیکن حدیث کا نحوی سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ اس ارشادِ نبوی میں جن اقدار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہیں :

۱۔ یہاں نوافل کا ذکر نہیں کیونکہ نفلیں انفرادی طور پر ادا کی جاتی ہیں اور ان کا گھر پر ادا کرنا زیادہ افضل ہے۔

۲۔ فرض نمازوں کے متعلق بیان بتایا جا رہا ہے کہ اسے باجماعت ادا کرنا چاہیے کیونکہ اسلامی

معاشرے کی روح سراسر اجتماعی نظام سے وابستہ ہے۔

۳۔ صلاۃ دراصل پورے سوشل نظام کی عکاسی ہے۔ یا یوں کہیے کہ اسلامی معاشرے میں امر و مامور کے روابط، اجتماعی تنظیم، نظامِ اطاعت، اخوت و مساوات، غلطی پر ٹوکنا مگر اجتماعیت پر جمے رہنا وغیرہ وغیرہ کے جس قدر بھی اجزائے معاشرہ ہیں ان سب کو ہر آن پیش نظر رکھنے کے لیے نماز ایک چھوٹا سا مشقی نمونہ ہے۔

۴۔ امامت کا اہل وہ ہے جو مجموعی حیثیت سے بہتر یعنی متقی ہو۔ مقتدیوں سے زیادہ پڑھا لکھا، زیادہ واقف کارِ مسائل، زیادہ ثقہ، زیادہ صحیح قرآن پڑھنے والا، زیادہ با اخلاق زیادہ متقی و پرہیزگار، زیادہ صاحبِ ایثار و بلند کردار وغیرہ ہو۔

۵۔ لیکن امام کے لیے ایسا معصوم ہونا ضروری نہیں (بلکہ شاید یہ ممکن بھی نہیں) کہ اس سے کوئی غلطی یا کوئی گناہ نہ ہوا ہو۔ غلطی یا گناہ سے کوئی خالی نہیں۔ ہاں اس کی غلطیوں یا معصیتوں کا علم بعض اوقات کسی کو نہیں ہوتا یا چند کو ہوتا ہے اور بعض اوقات عام طور پر سب کو ہو جاتا ہے۔

۶۔ اگر کسی کی بدکرداری کا علم سب کو ہو جائے تو امام کو خود ہی اپنی مسندِ امامت سے ہٹ جانا چاہیے۔ اگر وہ اعترافِ خطا کر کے تائب نہ ہو یا اپنی غلطی پر مصر ہو تو اسے منصبِ امامت سے ہٹا دینا چاہیے۔

۷۔ لیکن جب تک دوسرے بہتر امام کا انتظام نہ ہو جائے، خواہ بالکل عارضی ہو یا مستقل امام کا انتظام ہو، تب تک کیا جماعت ترک کر دینی چاہیے یا اس وقت تک اسی نا اہل امام کو گوارا کیے رہنا چاہیے؟ ہمارے خیال میں یہی ہے وہ سوال جس کا جواب اس زیرِ نظر حدیث میں دیا گیا ہے۔ جس کا مفہوم و مفاد یہ ہے کہ ایک نا اہل امام کی اقتدا میں باجماعت نماز کو گوارا کر لینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ مسجد میں فرداً فرداً یا مختلف گروپوں میں نماز ادا کی جائے۔ یہ اس لیے کہ اجتماعیت کا معاملہ صرف نماز تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا اثر زندگی کے دوسرے اجتماعی شعبوں پر بھی پڑے گا اور وہاں بھی اجتماعیت میں انتشار پیدا ہوگا۔ اسلام کی نظر میں انتشار، بے آئینی، بدنظمی کسی صورت گوارا نہیں کسی نا اہل کی امامت کو اہل امام ملنے تک

گوارا کرلینا گویا اھون البلیتین (LESSER EVIL) کو گوارا کرنے کے مترادف ہے۔ اگر ایک بڑے شر سے بچنے کے لیے کسی چھوٹے شر کو قبول کرلیا جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ چھوٹے شر کو قبول نہ کرکے بڑے شر کو دعوت دی جائے۔ اسی طرح ایک بڑی خیر کے لیے چھوٹی خیر کو قربان کردینا بھی غلط نہیں ہوتا۔

۸۔ اسلام یہ ہرگز نہیں پسند کرتا کہ امام کوئی فاجر ہو۔ وہ امام بر و متقی ہی کو پسند کرتا ہے۔ لیکن اس کی برتیت و پرہیزگاری کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ مقتدیوں سے پرہیزگاری میں بلند تر ہو۔ یہ ضروری نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ بے عیب ہو، بے خطا ہو یا معصوم ہو۔ مقتدیوں سے رذائل میں کم تر ہونا امام کے لیے کافی ہے یعنی مجموعی حیثیت سے اگر کوئی شخص امامت کے فرائض زیادہ بہتر طریق پر انجام دے سکتا ہو تو وہ امام ہوسکتا ہے لیکن یہ کوشش جاری رکھنی چاہیے کہ وہی امام بہتر سے بہتر ہوجائے یا کوئی اور بہتر سے بہتر امام حاصل ہوجائے۔ اور جب تک یہ نہیں ہوتا اسے گوارا کیے رہنا چاہیے اور اصلاح کی کوشش جاری رہنی چاہیے۔ تاکہ جماعت اور اس کے نظم و ضبط میں انتشار نہ پیدا ہو ورنہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے الگ ہونے کے بعد ایسا امام بھی میسر نہ آسکے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام کو مجموعی طور پر ایسا ہونا چاہیے کہ مقتدیوں کی غالب اکثریت اس سے مطمئن رہے۔ اس میں اتنی معقولیت ہونی چاہیے کہ غالب اکثریت اس کے خلاف نہ ہو، یا ہوجانے کا اندیشہ نہ ہو۔ سیدنا امیرالمومنین عمرؓ ایسے اماموں کو جن سے مقتدیوں کو شکایت پیدا ہو امامت سے ہٹا دیا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے انتشار پیدا کرنے میں اماموں کی بھی غلطی ہوتی ہے اور مقتدیوں کی بھی، اور اسلام نے دونوں کے لیے ہدایات دی ہیں۔

۹۔ یہاں مقتدیوں کو رواداری قائم رکھنے کی ہدایت دی گئی ہے کہ تمہارا امام اگر فاجر ہو اور کبائر کا بھی مرتکب ہوچکا ہو تو تم تبدیلی کی کوشش کے باوجود جماعتی نظم کو قائم رکھو ورنہ زندگی کے دوسرے اجتماعی شعبوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا اور وہاں بھی انتشار پیدا ہوگا۔

۱۰۔ یہاں لفظ ہے۔ وان عمل الکبائر۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ کبھی کبائر کا

مرتکب بھی ہو چکا ہو۔ اس کا یہ ترجمہ درست نہیں کہ: اگرچہ وہ کبائر کا ارتکاب کرتا رہتا ہو"
اس مفہوم کے لیے لفظ یوں ہوتا: وان کان یعمل الکبائر۔

ظاہر یہ کرنا ہے کہ اگر وہ کسی وقت کبائر کا مرتکب ہو چکا ہو اور اب اس نے توبہ کر کے اپنی روش بدل لی ہو تو اس کی گزشتہ باتوں کو بیچ میں نہ لاؤ۔ توبہ کے بعد کوئی گناہ قابلِ گرفت نہیں رہتا، معاف ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑا گناہ تو کفر و شرک ہے جب اس سے تائب ہو کر انسان مومن و مسلم بن جاتا ہے تو باقی گناہ تو اس سے کم درجے کے ہیں۔

۱۱۔ اسلام کا اصل اجتماعی نظام یہ ہے کہ پوری قوم کا ایک امیر ہو اور مختلف حلقوں میں اس کے نصب کردہ امرا ہوں۔ امیر صرف ایک مملکت ہی کا سربراہ نہیں ہوتا بلکہ وہ نماز پنجگانہ، جمعے اور عیدین کا بھی امام ہوتا ہے۔ حج کا بھی امیر ہوتا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ زیرِ نظر حدیث میں ایسے ہی امام کے متعلق ہدایات ہیں کہ اگر یہ فاجر بھی ہو اور مرتکب کبائر بھی رہ چکا ہو لیکن امارت کے ملکی فرائض بحُسن و خوبی انجام دے رہا ہو تو اس کی اطاعت و اقتدا کیے جاؤ کیونکہ وہ تمھیں ایک بڑے شر سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ وہ نہ رہے تو کسی دشمنِ اسلام کا تم پر غلبہ ہونے کا خدشہ ہے۔

اس سلسلے میں اثنا عشری فرقے کی ایک حدیث بڑی قابلِ غور ہے جو چاروں اصول کی کتاب میں موجود ہے۔ ہند سراج ابوجعفر (محمد باقر) سے سوال کرتا ہے کہ: میں شامیوں کو ہتھیار سپلائی کرتا اور ان کے ہاتھ فروخت کرتا رہا ہوں لیکن جب اللہ نے "امامت" کا معاملہ مجھ پر واضح کر دیا تو مجھے بڑی کوفت ہوئی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان دشمنانِ خدا کو ہتھیار سپلائی نہیں کروں گا۔" اس پر انھوں (محمد باقرؒ) نے فرمایا کہ:

احمل الیہم فان اللہ عز وجل یدفع بہم عدونا وعدوکم۔ یعنی الروم۔ فاذا کان الحرب بیننا فمن حمل الی عدونا سلاحا یستعینون بہ علینا فہو مشرک۔ (تہذیب الاحکام للطوسی ۶/۳۵۳، الکافی للکلینی ۱/۱۴۳، من لایحضرہ الفقیہ للقمی ۳/۱۰۶، الاستبصار فیما اختلف من الاخبار ۳/۵۵)

تم ان شامیوں کو ہتھیار سپلائی کرتے رہو کیونکہ اللہ ان کے ذریعے ہمارے تمھارے (بڑے) دشمن یعنی

رومیوں کو روکے ہوئے ہے۔ ہاں اگر ہمارے آپس میں جنگ ہو تو اس وقت جو ہمارے دشمن کو ہتھیار سپلائی کرے گا جس سے وہ ہمارے خلاف مدد حاصل کریں تو وہ مشرک ہوگا۔

اس "خبر" کا ابتدائی فقرہ بڑا قابلِ غور ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ اگر یہ خطرہ ہو کہ کوئی ظالم تر یا غیر مسلم مسلط ہو جائے گا تو اس صورت میں اپنے امام کی بہر حال مدد کرتے رہنا ضروری ہے کیونکہ یہ اھون البلیتین ہے یعنی ایک بڑے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے چھوٹے شر کو قبول کرنا کوئی غلط اصول نہیں۔

دراصل دیکھنا یہ ہے کہ ملک اور اہلِ ملک کی حفاظت امام کر رہا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے تو اس کے فجور کو اجتماعی خیر کے لیے گوارا کر لینے میں حرج نہیں۔ کیونکہ اگر یہ گوارا نہ کیا جائے تو پورے ملک پر دوسرے بدتر اور ظالم تر کے مسلط ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک غیر متقی اپنا فرض ادا کرنے میں متقی سے بہتر ثابت ہو۔ اگر ہمیں ایک چوکھٹ یا دروازہ بنوانا ہو تو ہم یہ نہیں دیکھتے کہ یہ بڑھئی (ترکھان) متقی پرہیزگار ہے یا نہیں۔ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اپنے فن کا پورا ماہر ہے یا نہیں۔ اسی طرح ملکی نظام چلانا بھی ایک فن ہے جس کا ہر متقی ماہر نہیں ہوتا۔ اگر غیر متقی یہ کام زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہو تو اسے متقی پر ترجیح حاصل ہوگی اور اس کی کئی غیر متقیانہ باتوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ یہی مفہوم ہے اس حدیث کا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہمیشہ غیر متقی کی اقتدا کرتے رہو۔ اگر کوئی متقی اہل مل جائے تو کیا کہنے ہیں۔ تلاش اور کوشش تو متقی ہی کے لیے کرتے رہنا چاہیے لیکن جب تک اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوتی تب تک غیر متقی کی اقتدا صرف اھون البلیتین کے طور پر گوارا کر لینا چاہیے۔

اب ایک عرصۂ دراز سے نماز کی امامت اور سیاسی امامت کے دو الگ الگ شعبے ہو گئے ہیں اس لیے نماز میں فاجر یا مرتکب کبائر کی امامت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ نماز کے امام تو تقریباً ہر جگہ مقتدیوں سے متقی تر ہوتے ہی ہیں البتہ سیاسی امام کی اقتدا شعبے کی نظر سے دیکھی جاتی ہے حالاں کہ اسی امامت کو شعبے سے بالاتر ہونا چاہیے۔ جب نماز جیسی عبادت میں بھی غیر متقی امام کی اقتدا کی جا سکتی ہے تو محض سیاسی لیڈرشپ قبول کرنے میں

کیوں ہچکچاہٹ ہوتی ہے؟ اس وقت دیکھنے کی صرف ایک ہی بات ہوتی ہے یعنی یہ سیاسی نظام کو چلانے کا اہل ہے یا نہیں؟ ہم میں میخ کیوں نکالتے ہیں کہ اس نے شرح وقایہ نہیں پڑھی ہے۔ یہ داڑھی نہیں رکھتا۔ یہ انگریزی بولتا ہے۔ یہ چھری کانٹے سے کھاتا ہے۔ انگریزی لباس پہنتا ہے۔ نمازِ پنجگانہ کا پابند نہیں۔ ٹخنے سے نیچے اس کی پتلون لٹکی رہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

تحریکِ پاکستان کے وقت قائد اعظم کی قیادت کو تسلیم نہ کرنے کے لیے اسی قسم کے دلائل سننے میں آتے رہے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ دلائل ان حضرات کی طرف سے پیش کیے جاتے رہے جو ایک غیر مسلم (ایم۔ کے گاندھی) کی قیادت کو بخوشی قبول کیے رہے۔

منشائے حدیث یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کا تم کسی کو لیڈر بناتے ہو اس وقت یہ دیکھ لو کہ یہ اس چیز کی لیڈرشپ کا اہل ہے یا نہیں۔ غیر متعلق خامیوں کو سامنے رکھتے چلے جاؤ گے تو ایک اہل کی قیادت سے محروم ہو جاؤ گے۔ سیاسی قائد کا معیاری تقویٰ صرف اسی قدر ہے کہ وہ خود غرض نہ ہو، ہمدردِ قوم ہو، دشمن سیاستدانوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اسے خریدا نہ جا سکے۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھا سکے۔ نظم و ضبط کو قائم رکھ سکے۔ اہلِ ملک کی ضروریاتِ زندگی پوری کر سکے اور ملک کی حفاظت کر سکے۔ غرض وہ اس سیاسی میدان میں قابلِ اعتماد ہو تو اس کی دوسری مذہبی کمزوریوں سے چشم پوشی کرنی چاہیے اور اس کی اصلاح کا ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو مصلح کو اس کا سچا ہمدرد و خیر خواہ ثابت کر سکے نہ کہ مخالف و دشمن بنا دے۔ کسی پر محض اعتراضات و طعن کرتے رہنے سے کوئی خیر خواہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

مسند احمد میں عیاض بن غنم سے ایک ارشادِ نبوی یوں مروی ہے:

من اراد ان ینصح لذی سلطان بامر فلا یبدئہ علانیۃ ولکن لیأخذ بیدہ ویخلو بہ فان قبل منہ فذاک والا فقد کان قد ادّی الذی علیہ۔

جو کسی معاملے میں کسی حاکم کی خیر خواہی کرنا چاہے وہ اسے علانیہ رسوا نہ کرے بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تنہائی میں لے جائے (اور بات سمجھا دے) اگر وہ مان جائے تو فبہا ورنہ سمجھانے والا اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ احکام اطاعت و اقتداء عام لوگوں کے لیے ہے۔ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ عوام کو تو اطاعت و اقتدا کا پابند کر دیا گیا ہے لیکن اولی الامر، حکام اور والیوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ وہ جو کچھ چاہیں کرتے پھریں۔ ایسی بات نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اولی الامر کو اس سے بھی زیادہ سخت احکام کا پابند کیا گیا ہے۔ مثلاً :

ما من امتی احد ولی من امر الناس شیئاً لم یحفظ بما یحفظ به نفسه واهله الا لم یجد رائحة الجنة۔ (طبرانی عن ابن عباس)

میرا کوئی امتی کہیں کا امیر بننے کے بعد اگر لوگوں کی اسی طرح نگہداشت نہ کرے جس طرح وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی کرتا ہے تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا۔

اللہ اکبر! اس سے بڑی وعید اور کیا ہو سکتی ہے اور وہ کونسا صاحب امر ہے جو اس حدیث پر عمل کرے اور عوام اس پر اپنی جانیں نہ چھڑکیں؟ تالیاں دونوں ہاتھوں سے بجتی ہیں۔ اس لیے آنحضورؐ نے اولی الامر اور رعایا دونوں کو ان کے فرائض یاد دلا دیے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اولی الامر بعض اوقات طاقت کے نشے میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور عوام بے چارے صرف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ زیر نظر حدیث میں دراصل عوام ہی کو سمجھایا گیا ہے کہ تم کوئی ایسا طرز اصلاح اختیار نہ کرو جس سے اولی الامر کے دل میں مزید ضد پیدا ہو۔ بلکہ اس کے ساتھ تعاون اور اطاعت کا شریفانہ انداز قائم رکھتے ہوئے نہایت خیر خواہانہ طریق اصلاح اختیار کرو۔